Date of Publication: 09-02-2014
PRICE Rs. 2/-
POSTED ON 10-11 Feb. 2014
R.N.I No. 2186/57
POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)
ہفت روزہ
# ہماری زبان
انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 February 2014
Issue: 7, Vol.:73
۱۵ تا ۲۱ر فروری ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۷، جلد نمبر: ۷۳

اداریہ

# بھرپور زندگی کے پچھتّر برس
# پروفیسر ہربنس مکھیا
## ایک اردو دوست
## ایک روشن خیال تاریخ داں

آبادی کے اعتبار سے ہندستان میں مسلمانوں کی دو حیثیتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ ہندستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور دوسری یہ کہ وہ ہندستان کی غیر دو اکثریت ہیں۔ ایسے معاشرے میں جہاں فرقہ وارانہ کشیدگی معمول کی شکل اختیار کر چکی ہو وہاں ایک طرف نمبر دو اکثریت کے طور پر پہلی اکثریت کو وہ اپنی رقیب دکھائی دیتی ہے اور دوسری طرف پہلی اقلیت کے طور پر اس کا وجود اکثریت کے کانوں میں خطرے کی گھنٹی کی طرح بجتا رہتا ہے۔ ایسے حالات میں لامحالہ ہماری نگاہیں ایسے افراد کی جانب اٹھتی ہیں جو ایک کشادہ ذہن اور صحیح سوچ اور فکر کے مالک ہوں۔ ان کے اندر کوئی فرقہ وارانہ جذبہ بھا نہ ہو۔ اس طرح کے افراد کی سب سے زیادہ ضرورت تاریخ نویسی کے شعبے کو ہوتی ہے۔ کسی ملک کی سب سے بڑی اقلیت کو ایک اور صورت حال کا سامنا ہر وقت رہتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے بارے میں عام لوگوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات سب سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ہمارے صالح ذہن کے تاریخ داں اور تاریخ اپنی تحریروں میں روشن خیالی کے ساتھ ایسے مسائل کا احاطہ کرتے رہے ہیں۔

ایسے میں صحیح تاریخی سیاق و سباق وقت کی اہم ضرورت بن جاتا ہے۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر اور ریکٹر ڈاکٹر ہربنس مکھیا ایسی ہی ایک شخصیت ہیں۔ وہ ہمارے ملک کے ایک معروف تاریخ داں ہیں۔ 2014 پروفیسر مکھیا کی عمر کا ڈائمنڈ جوبلی سال ہے۔ وہ یکم فروری 1914 کو اپنی عمر کی 75 منزلیں پوری کر چکے ہیں، جس کے لیے ہم صمیم قلب سے انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ 'عہد اکبری میں مورخین اور تاریخ نویسی' کے موضوع پر دہلی یونیورسٹی سے انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ پروفیسر مکھیا اردو تو پہلے ہی سے جانتے تھے، مغل عہد کے مورخین اور تاریخ نویسی پر کام کرتے ہوئے انھوں نے فارسی کا مطالعہ کرنا بھی ضروری سمجھا چناں چہ ایسے ماخذ کا بھی جن کے انگریزی تراجم موجود تھے انھوں نے براہ راست فارسی میں ہی



مطالعہ کیا۔ ہندستان کے مسلم حکمرانوں کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ ان کے زمانے میں بڑی تعداد میں غیر مسلم آبادی کو مسلمان بنایا گیا۔ گذشتہ دنوں رضا لائبریری رام پور نے پروفیسر مکھیا کو ایک لکچر کی دعوت دی تھی۔ اس لکچر کے دوران انھوں نے بتایا کہ 1830 تک جو ہندستان میں مسلمانوں کے عہد کا بالکل آخری زمانہ تھا، ہندستان میں ہر چھے افراد پر ایک مسلمان تھا۔ آگے چل کر 1830 سے 1841 تک جسے انگریزوں کا عہد حکومت کہنا چاہیے، 1941 کی مردم شماری کے مطابق چار ہندستانیوں میں ایک مسلمان تھا گویا مسلمانوں کے آٹھ سو برس کے عہد حکومت میں 16% مسلمان تھے اور اگلے سو برس میں جب مسلم حکمرانوں کا دور ختم ہو چکا تھا ان کی آبادی میں 50% کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح ہندستان کے ہارٹ لینڈ میں جو مسلم حکمرانوں کے تصرف میں تھا، مسلمانوں کی آبادی 14% سے آگے نہیں بڑھی۔ پروفیسر مکھیا نے اپنے اس لکچر کے دوران اس امر کی بھی نشان دہی کی کہ ہندستان کے چاروں کونوں کشمیر، مغربی پنجاب، بنگلہ دیش اور مالا بار جو شمالی ہند کے مسلم حکمرانوں کے تسلط اور اقتدار سے بالکل باہر کے علاقے تھے وہاں کشمیر میں مسلمان 98%، مغربی پنجاب میں 75%، بنگلہ دیش میں 80% اور مالا بار میں 92% تھے۔

پروفیسر مکھیا اردو ادب خصوصاً اردو شاعری میں نہ صرف گہری دل چسپی رکھتے ہیں بلکہ خود بھی بلند پایہ شاعر ہیں۔ آج سے لگ بھگ پندرہ سال پہلے انھوں نے انگریزی میں ایک طویل مضمون اردو غزل پر تحریر کیا تھا جس کا عنوان تھا "Celebration of failure as dissant in Urdu Gazal" یعنی اردو غزل میں ناکامی کا جشن احتجاج کے روپ میں۔ اس مضمون کو برصغیر ہند و پاک میں بے حد دل چسپی سے پڑھا گیا اور دونوں جگہ اس کے اردو تراجم بھی ہوئے۔ پاکستان کا روشن خیال طبقہ بھی پروفیسر مکھیا کا نہایت قدرداں ہے۔ وہ دو بار پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں، ایک بار 1997 میں جب وہ اپنے طور پر پاکستان گئے تھے اور دوسری بار دسمبر 2013 میں جب کراچی کی حمزہ علوی فاؤنڈیشن نے انھیں Liberal Democracy کے موضوع پر لکچر کی دعوت دی تھی۔ ان کے اسی سفر کے دوران انھیں لاہور کی LUMS یعنی لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سسٹم کی جانب سے ایک مذاکرے میں بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ مذاکرہ راج موہن گاندھی کی کتاب 'پنجاب فروم اورنگ زیب ٹو لورڈ ماؤنٹ بیٹن' کے رسم اجرا کے موقعے پر منعقد کیا گیا تھا۔ پاکستان کا روشن خیال طبقہ پروفیسر مکھیا کا بہت دل دادہ ہے اور وہ جلد ہی انھیں پھر کسی لکچر کی دعوت دینے والے ہیں۔ ان کی متعدد نظمیں 'شب خون' کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکی ہیں اور ایسی ہی کچھ نظمیں 'اثبات' میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے کچھ اور نظمیں بھی کہی ہیں جن سے جلد ہی اردو شاعری کے دل دادہ محظوظ ہو سکیں گے۔

ہم آخر میں ایک بار پھر پروفیسر ہربنس مکھیا کو زندگی کے اس انتہائی کامیاب تین چوتھائی صدی کے سفر کی دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ ان کے علمی مرتبے میں مزید اضافہ ہو۔

**اطہر فاروقی**

## پیدائش کے ۸۸ ویں برس پر یادگاری مضمون

# دورِ آئندہ کی ادیبہ، قرۃ العین حیدر

ڈاکٹر مظفر حسین سید (11/29، سرسید روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 110002)
E-mail: syedmh92@yahoo.com

جو آنے والا ہے مجلس ہم پر آفریں کرے گا، یہ مصرع جس شخصیت پر حرف بہ حرف صادق ہے، اس کا نام نامی قرۃ العین حیدر ہے۔ اردو کی عظیم قلم کار قرۃ العین حیدر عرف عینی اکیسویں صدی کی ادیبہ تھیں، جنھوں نے شاید غلطی سے بیسویں صدی کے اوائل میں جنم لے لیا، اسی لیے زمانہ انھیں سمجھ نہ سکا۔ البتہ یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کے پڑھنے والوں نے انھیں سمجھے بغیر (بلکہ اکثر پڑھے بغیر ہی) ان کی تعریف دل کھول کر کی، اتنی تعریف کہ آسمان ادب پر بٹھا دیا۔ یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ قرۃ العین حیدر اس مقام کی مستحق نہیں تھیں، جس پر فائز کی گئیں، وہ تو اس سے بھی بلند مقام کی حق دار تھیں، بشرطیکہ ان کے ہم عصر ان کو صحیح اور درست آنک سکتے۔ یہاں اس دل چسپ اور سبق آموز حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے کہ پچاس کی دہائی سے ہی قرۃ العین حیدر کا ایسا رعب اور دبدبہ اردو کے ادبی حلقوں پر قائم ہو گیا تھا کہ کوئی ان کے ادبی مقام کو ذرہ برابر بھی کم کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا، اور یہ ان کی بڑی حصولیابی تھی۔ انھوں نے تمام تحریکات، ادبی انجمنوں، جماعتوں اور تمام ادبی گروہ بندیوں سے بالاتر ہو کر اپنے قلم کی بادشاہت قائم کی، جسے بالکل صحیح و لغوی معنی میں قلمرو کہا جا سکتا ہے۔

مرزا غالب کی طرح قرۃ العین حیدر بھی اپنے عصر کی نہیں بلکہ دورِ آئندہ کی قلم کار تھیں، ادیبہ تھیں۔ غالب کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا کہ ان کے زمانے کے لوگوں (شاعروں، تذکرہ نگاروں، خواص، ارباب اقتدار حتیٰ کہ عوام) نے نہ انھیں سمجھا اور نہ ہی سمجھنے کی کوشش کی، لہٰذا اردو کے اس عظیم شاعر کو اس امید پر قانع ہونا پڑا کہ آنے والا زمانہ اس کی قدر کرے گا، اس کی اہمیت جانے گا، اور یقیناً ایسا ہوا بھی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے غالب کو بیسویں صدی نے پہچانا، غالب شناسی کا نیا عہد شروع ہوا۔ ان کی صدی مناتے مناتے اردو والوں نے ان کا حق ادا کر دیا، اور اردو دنیا ہی کیوں، اردو کے دائرے کے باہر بھی ہندوستان، پاکستان، برطانیہ، بلکہ ایک جہان نے ان کی عظمت کے آگے سرنگوں کر دیا۔ تاہم اس ذکر کو یہیں تک رہنا چاہیے، کیوں کہ اس مضمون کا موضوع غالب نہیں، بلکہ ان کی رخصت کے ڈیڑھ سو برس بعد اس جہان آب و گل میں تشریف فرما ہونے والی ایک عظیم قلم کار ہے، جس نے اگرچہ شاعری بھی کی مگر زبان فرنگ میں۔ اب یہ بات دگر کہ اس نے نثر میں جو شاعری کی، اس نے اس کی نثر کو اعلا ترین منازل سے ہمکنار کر دیا۔ اس قدر کہ لوگ عش عش کر اٹھے، قارئین بھی اور ناقدین بھی، اور اس حد تک کہ شاید خود مرزا غالب بھی موجود ہوتے تو نثر نگاری اور نفس مضمون دونوں کی بنا پر قرۃ العین کو اپنی آنکھ کا تارا قرار دیتے۔

جو شکوہ غالب کو تھا، وہی قرۃ العین کو بھی تھا، انھوں نے خود ایک بار کہا تھا: "اچھا ادب بہت کم لوگوں تک پہنچتا ہے، جیسے میں جو کچھ لکھتی ہوں، جانتی ہوں، اسے پڑھنے والے لوگ کم ہی ہیں"۔ لیکن انھوں نے اس کے ساتھ ہی دوسرے سانس میں یہ بھی کہا تھا "اچھا ادب آپ کو پڑھنے پر مجبور کرتا ہے، آج آپ نے نہیں پڑھا تو وہ آپ کو دس سال بعد پڑھنے پر مجبور کرے گا۔ غالب اور شیکسپیئر کو لیجیے، آج بھی ان کا ادب اتنا ہی تازہ ہے"۔

بہر کیف قرۃ العین حیدر غالب سے کہیں زیادہ خوش قسمت تھیں کہ سمجھا یا نہ سمجھا، ان کے ہم عصروں نے انھیں کندھوں پر بٹھایا، ان کی پذیرائی کی، مذاکروں میں ان پر گفتگو کی گئی، ان پر



اتنا کچھ لکھا گیا (اور لکھا جا رہا ہے) کہ شاید تحقیق کے چند اردو ادیبوں کے علاوہ کسی اور پر اتنا کچھ نہیں لکھا گیا۔ انھیں دور حاضر کے تمام انعامات و اعزازات (ساہتیہ اکادمی انعام، گیان پیٹھ انعام اور پدم بھوشن سمیت) سے نوازا گیا، علاوہ ازیں معاصروں کی عظیم ادیبہ سے بالا ایک عظیم دانش ور بھی تسلیم کیا گیا۔ ملک کی دو موقر دانش گاہوں (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی) نے انھیں مہمان پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیا، اور ان کے دوران قیام دونوں درس گاہوں کے بے شمار طلبہ اور تحقیق کاروں نے ان کے علم و عرفان سے فیض حاصل کیا، اپنے ذہن و دل کو منور کیا۔ اس کے علاوہ کئی مغربی دانش گاہوں و علم گاہوں نے بھی انھیں وقتاً فوقتاً دعوت تقریر و تدریس دی۔ علی گڑھ کا ذکر آیا ہے تو ایک دل چسپ بات کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ رشید احمد صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جب وہ کسی محفل میں کسی معقول شخص کو دیکھتے تو انھیں یہ گمان ہوتا کہ ہو نہ ہو یہ شخص ضرور علی گڑھ کا پروردہ ہے، جب وہ اس کے قریب جاتے اور تعارف حاصل کرتے تو اگر وہ فرد فرید علی گڑھ کا تعلیم یافتہ و تربیت یافتہ نکلتا تو ان کی خوشی دوچند ہو جاتی، تاہم سوئے اتفاق اگر وہ شخص علی گڑھ سے فیضیاب ہونے سے محروم رہا ہوتا تو رشید صاحب خیال کرتے کہ کاش اگر یہ شخص علی گڑھ آیا ہوتا، اور رہا ہوتا تو اس کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔ یہ بات قرۃ العین حیدر پر بھی صادق آتی ہے کہ موصوفہ نے دہرہ دون، دہلی اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی، لیکن اتفاق، وہ علی گڑھ نہ جا سکیں اور نہ ہی وہاں تعلیم حاصل کر سکیں، لہٰذا علی گڑھ کا ایک نمک خوار و وفادار ہونے کے ناطے راقم الحروف بھی یہ خیال کرتا ہے کہ کاش ہماری عینی آپا نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی ہوتی، جب کہ ان کا علی گڑھ پر بجا طور پر حق تھا، ان کی پیدائش علی گڑھ میں ہوئی تھی اور ان کے والد محترم سجاد حیدر یلدرم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اولین رجسٹرار تھے، مگر اب تو یہی کہا جائے گا کہ علی گڑھ خود قرۃ العین حیدر سے محروم رہا۔

قرۃ العین حیدر کے جد امجد ایک صوفی اور شہید تھے، ان کے والد سنی العقیدہ اور والدہ شیعہ تھیں، دونوں اپنے اپنے عقیدہ پر قائم تھے، لیکن باہم کوئی تضاد نہیں تھا، بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنے مسلک کے انتخاب کی اجازت تھی، اگرچہ قرۃ العین حیدر نے اہل سنت کی جماعت میں رہنا قبول کیا، لیکن ان کے یہاں غلو نہیں تھا، مسلکی رواداری ان کی گھٹی میں تھی، اور یوں بھی ان کا خانوادہ آزادی رائے اور روشن خیالی کا علمبردار تھا، علما، فضلا اور دانشوروں کا خاندان تھا، پھر شدت کہاں اور تجاوز کیسا؟ قرۃ العین حیدر بہ ظاہر جدید تھیں، مگر اندر سے خالصتاً مشرقی روایات کی علمبردار۔ انھوں نے ن م راشد پر اپنے خاکے میں جو فقرہ راشد کے بارے میں لکھا ہے، وہ خود ان پر بھی بعینہ صادق آتا ہے، وہ کہتی ہیں کہ "راشد صاحب کا طرزِ رہائش انگریزی ہے اور دماغ مشرقی"۔ ویسے بھی اس امر کے ان گنت ثبوت موجود ہیں کہ قرۃ العین حیدر باطنی طور پر نہ صرف ایک پکی مسلمان تھیں بلکہ وہ ملت مسلمہ کو درپیش مسائل اور خصوصاً اس کی پس ماندگی کے سلسلے میں خاص تشویش میں مبتلا رہتی تھیں اور ملی خدمات کے تحت معاشرتی کام کرنے والے چیدہ حضرات کو عزیز بھی رکھتی تھیں۔ سید حامد نے اپنے ایک مضمون میں یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ آخر عمر میں قرۃ العین حیدر صاحبہ کسی بزرگ سے بیعت ہو گئی تھیں، حالاں کہ انھوں نے اس بات کو عینی صاحبہ کے مزاج سے بعید خیال کیا ہے، تاہم ایسے شاہد بھی ہیں کہ قرۃ العین حیدر کے ذاتی کمرے میں کسی بزرگ کی تصویر آویزاں تھی۔ نیز یہ امر تو اظہر من الشمس ہے کہ قرۃ العین کو اپنے اسلاف پر زبردست فخر تھا، وہ اپنے عالم، فاضل بزرگوں کا ذکر بڑی عقیدت سے کرتی تھیں۔ انھوں نے اپنے کئی بزرگوں کے بارے میں لکھا بھی اور ان کے کارناموں کو روشناس کرانے کے لیے کاوشیں بھی کیں، انھوں نے اپنے خاندان کو ہمیشہ ایک روایتی ادارہ قرار دیا۔ اب اسے ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ انھوں نے کسی شخص کو اپنا ہم سفرِ زیست بنانے کے لائق نہیں گردانا، اور اپنی حیات کا سفر تنہا ہی طے کیا، شاید ان کی کسوٹی پر کوئی کھرا نہیں اتر سکا ہوگا۔

قرۃ العین حیدر صفِ اول کی ادیبہ تھیں، ان کی شناخت بہ حیثیت افسانہ نگار اور ناول نگار ہی کی گئی اور کی جاتی رہے گی، اگرچہ انھوں نے خاکے بھی لکھے، لیکن یہ انکشاف (ان کے لیے جو پہلے سے واقف نہیں) دل چسپی کا موجب ہوگا کہ ان کی اولین تخلیقی کاوش، کوئی افسانہ یا نظم نہیں بلکہ ایک کارٹون تھا، جو بچوں کے ایک رسالے میں شائع ہوا تھا۔ ان کی ابتدائی دل چسپی مصوری

میں تھی اور انھوں نے اس کی تربیت بھی حاصل کی تھی، گو کہ بعد ازاں وہ اسے اپنا مشغلہ نہ بنا سکیں یا بنانا پسند نہیں کیا، تاہم وہ شوقیہ تصاویر بناتی تھیں اور ان کی تصاویر ان کے دولت کدے کی دیواروں پر ہمیشہ آویزاں رہیں۔ اپنی کتاب کا سرورق خود بنانا بھی ان کی پہلی ترجیح ہوتا تھا، یہ بات اور کہ دیگر مصروفیات کے باوصف، اکثر ایسا ممکن نہیں ہوتا تھا، انھوں نے اپنی ترتیب کے تحت دو تصویری مجموعے بھی شائع کرائے تھے اور شاید اسی رعایت سے انھوں نے اپنے خاکوں کے انتخاب کا نام بھی 'کچھ تصویریں' رکھا تھا۔ مصوری کے علاوہ موصوفہ کو موسیقی سے بھی گہری دل چسپی تھی، کہ یہ بھی ان کی خاندانی روایت تھی۔ وہ خود ایک تربیت یافتہ ساز نواز تھیں اور کئی مشکل سازوں پر یہ کمال اپنے فن کا جادو بکھیر سکتی تھیں۔

اکیسویں صدی کی آمد سے قبل ہی پیدا ہو جانے کے علاوہ قرۃ العین حیدر کے ساتھ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ وہ اردو کی ادیبہ تھیں (گو کہ یہ اردو کی خوش قسمتی ہے)۔ بالاتفاق اگر وہ انگریزی، فرانسیسی یا روسی زبان کی مصنفہ ہوتیں تو صورت حال دگر ہوتی، ویسے بھی مزاجاً اور اسلوباً وہ مغربی طرز کی ادیبہ ہیں، اس لیے شروع میں ان کی تحریریں کسی کے پلے نہیں پڑیں، برسوں پہلے انھوں نے شہریار اور ابوالکلام قاسمی کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا:

"مجھے یاد ہے کہ اس زمانے میں (ابتدائی دنوں میں) لوگوں نے برابر کہا کہ آپ جو باتیں لکھتی ہیں، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، باقی ادیبوں کے افسانے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور یہ کہ آپ انگریزی الفاظ کیوں استعمال کرتی ہیں اور یہ کہ آپ جو ماحول دکھاتی ہیں، وہ بھی عجیب و غریب اور انوکھا ہوتا ہے"۔

شکر ہے کہ قرۃ العین حیدر کو بیسویں صدی کا آخر اور اکیسویں صدی کا دور اول نصیب ہوا، لوگوں نے انھیں کچھ کچھ سمجھا اور اس کا اعتراف بھی کیا، اور تو اور ان کا شہرۂ آفاق ناول 'آگ کا دریا' بھی بالآخر قارئین کی سمجھ میں آنے لگا۔ سچ یہ ہے کہ قرۃ العین حیدر اردو کی ایسی ادیبہ ہیں جو ہمیشہ نامفہوم لکھتی رہیں اسی لیے کسی کی سمجھ میں آیا، کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

قرۃ العین حیدر تمام ادبی حد بندیوں سے ہمیشہ بالاتر رہیں، انھوں نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں ہوش سنبھالا، ترقی پسندوں کے ساتھ لکھا، لیکن نہ کبھی خود کو ترقی پسند کہا اور نہ عوامی ادب کے سراب میں گم ہوئیں، ان کی شہرت جب بام عروج پر تھی، تب جدیدیت کا پرچم بلند ہوا، وہ اس سے بھی الگ تھلگ رہیں، اور اس کے بعد، مابعد جدیدیت کے دور میں بھی۔ انھیں ترقی پسندوں نے بھی سراہا اور جدیدیت پسندوں نے بھی انھیں اپنا سردار مانا، لیکن وہ کنول کے پھول کی طرح ہر گروہ بندی اور درجہ بندی سے بلند رہیں۔ دراصل وہ تو خود پیدائشی جدید بھی تھیں اور ترقی پسند بھی۔ ناقدین نے انھیں "کلاسیکی" قرار دیا، مگر انھوں نے اس خطاب کو بھی قبول نہیں کیا، مذکورہ بالا انٹرویو میں انھوں نے یہ بھی کہا تھا:

"اگر میری تحریروں کو دیکھ کر کوئی مجھے رومانیت پسند کہتا ہے تو کہے، اس لیے کہ میں سمجھتی ہوں کہ میرا ذہن کلاسیکی نہیں ہے، میں بنیادی طور پر رومانٹک ہوں، دیکھیے رومانیت جو ہے، ظاہر ہے، مجھے بتانے کی ضرورت نہیں... زیادہ تر جو دنیا کا ادب ہے اس کی بنیاد رومانٹک ہی ہے۔ رومانٹک اپروچ۔ تو بہر حال میں بنیادی طور پر رومانٹک ہوں... یہاں رومانٹسزم سے میرا مطلب وہ رومانس نہیں ہے، عشق و محبت کا چکر نہیں ہے، یہ ایک بالکل مختلف شے ہے، تو یہ ہے کہ آپ احساس، کھوج اور گریہ، حسرت، وفور جذبات، تخیل اور تحیر، انفرادیت پسندی اور جو کچھ ہے... مطلب یہ ہے کہ جتنی اس طرح کی چیزیں ہیں، انھی سے رومانی جذبہ بنتا ہے، وہ جو ادب کا رومانٹک

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

# اشاریہ 'ہماری زبان'

جنوری تا دسمبر 2013

تیسری اور آخری قسط

محمد عارف خاں

## وفیات

| متوفی | تاریخ وفات | شمارہ |
| --- | --- | --- |
| حنیف نقوی | ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۲ء | ۸تا۱۴رجنوری |
| سید شبیہ حسن | ۲۵ر نومبر ۲۰۱۲ء | ۲۲تا۲۸رجنوری |
| پروفیسر ولی الحق انصاری | ۲۸ر جنوری ۲۰۱۳ء | ۸تا۱۴رفروری |
| سالک لکھنوی | ۴ر جنوری ۲۰۱۳ء | ۲۲تا۲۸رفروری |
| پروفیسر تنویر احمد علوی | ۲۰ر فروری ۲۰۱۳ء | یکم تا ۷ر مارچ |
| سید امین اشرف | ۷ر فروری ۲۰۱۳ء | ۸تا۱۴ر مارچ |
| مولانا حامد الانصاری انجم | ۱۷ر فروری ۲۰۱۳ء | " " |
| پروفیسر شمس تبریز | ۱۹ر جنوری ۲۰۱۳ء | ۲۲تا۲۸ر مارچ |
| مائل تالا | ۱۹ر فروری ۲۰۱۳ء | یکم تا ۷ر اپریل |
| سید اصغر علی | ۵ر مارچ ۲۰۱۳ء | " " |
| نصرت محی الدین | ۴ر اپریل ۲۰۱۳ء | ۲۲تا۲۸ر اپریل |
| اصغر علی انجینئر | ۱۴ر مئی ۲۰۱۳ء | یکم تا ۷ر جون |
| سکندر احمد | ۴ر مئی ۲۰۱۳ء | یکم تا ۷ر جولائی |
| قمر علی عباسی | ۳۱ر مئی ۲۰۱۳ء | " " |
| اختر پیامی | ۹ر اپریل ۲۰۱۳ء | " " |
| تمنا مظفر پوری | ۴ر مئی ۲۰۱۳ء | ۱۵تا۲۱ر جولائی |
| شبنم گورکھپوری | ۱۱ر جولائی ۲۰۱۳ء | یکم تا ۷ر اگست |
| ڈاکٹر ساغر جیدی | ۱۸ر جون ۲۰۱۳ء | " " |
| پروفیسر عبدالرزاق فاروقی | ۱۵ر جون ۲۰۱۳ء | ۱۵تا۲۱ر اگست |
| ڈاکٹر فرمان فتح پوری | ۳ر اگست ۲۰۱۳ء | ۲۲تا۲۸ر اگست |
| حسن فرخ | ۱۴ر جولائی ۲۰۱۳ء | یکم تا ۷ر ستمبر |
| محمد خالد روشن خالد بدایونی | ۲۳ر اگست ۲۰۱۳ء | ۱۵تا۲۱ر ستمبر |
| پروفیسر لطف الرحمن | ۳۱ر اگست ۲۰۱۳ء | " " |
| ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی | یکم ستمبر ۲۰۱۳ء | ۲۲تا۲۸ر ستمبر |
| شاہ امیر اللہ نظامی | ۴ر ستمبر ۲۰۱۳ء | " " |
| ڈاکٹر ودیا ساگر آنند | ۲۷ر ستمبر ۲۰۱۳ء | ۸تا۱۴ر نومبر |
| مسعود علی خاں اختر | ۲۷ر اگست ۲۰۱۳ء | " " |
| سکندر عرفان | ۲۸ر اگست ۲۰۱۳ء | ۱۵تا۲۱ر نومبر |
| محمد شریف | ۲۸ر اکتوبر ۲۰۱۳ء | " " |
| ظفر ندیم | ۱۹ر نومبر ۲۰۱۳ء | ۸تا۱۴ر دسمبر |
| محمد نور بخش | ۲ر نومبر ۲۰۱۳ء | " " |
| عبدالحمید شمسی | ۱۴ر نومبر ۲۰۱۳ء | " " |
| بلراج کومل | ۲۵ر نومبر ۲۰۱۳ء | ۱۵تا۲۱ر دسمبر |
| معراج فیض آبادی | ۳۰ر نومبر ۲۰۱۳ء | " " |
| پروفیسر شکیب ایاز | ۱۷ر نومبر ۲۰۱۳ء | " " |
| اشتیاق حسین عرف وحشی مرادآبادی | ۱۷ر نومبر ۲۰۱۳ء | ۲۲تا۲۸ر دسمبر |
| کیف الاثر | ۱۴ر نومبر ۲۰۱۳ء | " " |

# اردو دُنیا

## اردو مترجمین کے تقرر کا عمل نہ شروع ہونے سے مایوسی

اناؤ (۲۳ جنوری)۔ ریاستی حکومت کے چیف سکریٹری کے احکام کے مطابق سرکاری محکموں میں اردو مترجمین کے خالی عہدوں پر تقرری کا عمل ابھی تک شروع نہ کیے جانے سے درخواست گزاروں میں ناامیدی ہے اور لوگ حکومت اور انتظامیہ پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے ہیں۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ درخواست گزاروں نے ۹ ماہ قبل اردو مترجمین کے لیے درخواست دی تھی جس پر ابھی تک کسی طرح کی کوئی کارروائی شروع نہیں کی گئی۔ خیال رہے کہ ۹ مہینے قبل ڈی ایم کی جانب سے ڈسٹرکٹ اناؤ کی طرف سے ضلع کے مختلف محکموں میں اردو مترجمین کی ۲۱ خالی جگہوں کے لیے درخواستیں طلب کی گئی تھیں جس میں ضلع و بیرون ضلع کے تقریباً تین ہزار اردو داں بے روزگاروں نے اس امید کے ساتھ درخواست گزاری تھی کہ جلد ہی ان کو روزگار مل جائے گا لیکن ضلع انتظامیہ کی ناہلی کی وجہ سے ابھی تک کسی بھی امیدوار کو کسی طرح کی کارروائی کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی جس سے درخواست گزاروں اور سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا خواب دیکھنے والے امیدواروں میں ناامیدی کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ ایک درخواست گزار نے بتایا کہ اس نے ریاستی چیف سکریٹری جاوید عثمانی کو بھی ایک درخواست دے کر کہا ہے کہ اناؤ ڈسٹرکٹ نے ۲۰۱۳ء میں جو اردو مترجمین کی درخواستیں لی تھیں اس پر کسی طرح کی کوئی کارروائی نہ کیے جانے سے بے روزگاروں میں ناراضگی پائی جا رہی ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل

### لیکن مقابلہ جاتی امتحانات کا جواب آج بھی اردو میں لکھنے کی اجازت نہیں

کولکاتا (۲۰ جنوری)۔ مغربی بنگال اقلیتی کمیشن کی جانب سے اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا کہ ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیے جانے کے باوجود مقابلہ جاتی امتحانات میں اردو زبان میں سوالات کے جواب حل کرنے کی سرکاری طور پر اجازت نہیں دی گئی ہے۔ یہ بات اقلیتی کمیشن کے چیئرمین اعتاج علی شاہ نے بتائی۔ انھوں نے کہا کہ حکومت نے ان اضلاع میں جہاں آبادی کے دس فیصد لوگ اردو بولتے ہیں، اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے لیکن یہ صرف کاغذی فیصلہ بن کر رہ گیا ہے۔ کمیشن اس بارے میں حکومت کو مکتوب بھیجے گی۔ انھوں نے اردو کے ساتھ اس امتیازی سلوک کے لیے سرکاری افسروں کو ذمہ دار ٹھہرایا۔

(آبشار۔ کلکتہ)

## معروف صحافی وشاعر چندر بھان خیال کو 'قومی اقبال سمان'

نئی دہلی (۱۶ جنوری)۔ اردو ادب کے میدان میں نمایاں خدمات کے اعتراف میں مدھیہ پردیش حکومت کی طرف سے دیا جانے والا 'قومی اقبال سمان' اس مرتبہ اردو کے ممتاز شاعر اور صحافی چندر بھان خیال کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ مدھیہ پردیش سرکار کے محکمۂ ثقافت کی اطلاع کے مطابق یہ اقبال سمان بھوپال میں ۲۶ جنوری ۲۰۱۴ء کو ایک تقریب میں ریاست کے گورنر کے ہاتھوں دیا جائے گا جو دو لاکھ روپے نقد، توصیف نامہ، شال اور شری پھل پر مشتمل ہے۔ اس سے قبل یہ سمان اردو کی کئی ممتاز ہستیوں کو دیا جا چکا ہے۔

چندر بھان خیال کا جنم ۳۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو قصبہ پانی ہوشنگ آباد، مدھیہ پردیش میں ہوا تھا۔ وہ ۱۹۶۶ء سے دہلی میں مقیم ہیں۔ اس دوران وہ اردو روزنامہ 'تیج' اور 'سویرا' نئی دہلی میں سب ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۸۱ء سے ۲۰۰۶ء تک دہلی سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ 'قومی آواز' سے وابستہ رہے۔ ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۱ء تک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے وائس چیئرمین رہے۔ وہ مرتبہ دہلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کے ممبر رہے اور آج کل ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور ایگزیکیٹو بورڈ کے ممبر ہیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## علی نگر پرائمری اسکول میں اردو اساتذہ کی تقرری

اسلام پور، مغربی بنگال۔ اسلام پور شہر کے علی نگر میں واقع پرائمری اسکول میں ایک اور نئے اردو میڈیم استاد کی بحالی سے مذکورہ پرائمری اسکول میں اردو میڈیم اساتذہ کی تعداد اب 3 ہو گئی ہے۔ حکومت کے اس اقدام سے متعلقہ پرائمری اسکول کے اردو میڈیم طلبہ کے سرپرستوں کو اپنے بچوں کے مستقبل کو لے کر جو فکر اور پریشانی لاحق تھی کی نئی بحالی سے وہ اب تقریباً دور ہو گئی ہے۔ یہ اطلاع پرویز عالم اور عبدالرحمن نے مشترکہ طور پر دی۔ غور طلب ہے کہ متذکرہ پرائمری اسکول میں اردو میڈیم اساتذہ کی بحالی ہوئی تھی، لیکن مزید اردو میڈیم اساتذہ کے لیے کوشش ہو رہی تھی۔ اسی کے تحت دوسری اور تیسری بحالی ہوئی، اس سے سرپرستوں میں خوشی ہے۔ مقامی لوگوں اور ذمہ داروں نے محکمۂ تعلیم کے عہدیداروں کا اس تقرری کے لیے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ایک مدت کے بعد ہی سہی متعلقہ محکمہ نے علی نگر کے اردو میڈیم بچوں سے انصاف کیا۔

(آبشار۔ کلکتہ)

## اردو معلمین نے شکایتی سیل کی تشکیل کا کیا مطالبہ

ہاپوڑ (۲۰ جنوری)۔ تقرری خط ملنے سے محروم اردو معلم امیدواروں نے ضلع مجسٹریٹ پر اشانتو سے ملاقات کر کے ان سے شکایتی سیل کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں ضلع مجسٹریٹ نے ضلع بیسک تعلیم افسر کو سیل تشکیل کرنے کی ہدایت دی۔ واضح رہے کہ اتر پردیش میں 4280 اردو معلمین کی بھرتی کی کارروائی چل رہی ہے۔ اس معاملے میں امیدواروں کے ذریعے انتخاب کے سلسلے میں موصول ہونے والی شکایات کو حل کرنے کے لیے اتر پردیش کے بیسک تعلیم سکریٹری نے سبھی ریاست کے تمام ضلع بیسک تعلیم افسران کو شکایتی سیل تشکیل کرنے کی ہدایت دی تھی لیکن ہاپوڑ میں مذکورہ ہدایت کی تعمیل نہیں کی گئی، جس کی وجہ سے تقرری خط نہ ملنے سے امیدواروں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ آج اردو معلم امیدوار شبینہ خاتون، شباہت، سلیم احمد، فرزانہ، اقبال احمد اور شازیہ وغیرہ نے ضلع مجسٹریٹ سے ملاقات کی۔

(آئی۔ لکھنؤ)

## خواجہ احمد عباس مولانا الطاف حسین حالی اور منشی پریم چند کی روایت کی توسیع اور تفسیر تھے: پروفیسر علی احمد فاطمی

الہ آباد (پریس ریلیز)۔ ادبی تنظیم قلم کار کی جانب سے مرزا غالب روڈ پر واقع ادارۂ نیا سفر کے دفتر میں ایک ادبی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو کے معروف ترقی پسند ادیب، ناقد اور شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کے استاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنا مقالہ بعنوان 'خواجہ احمد عباس کے دو واقعے' پیش کیا۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ ترقی پسند ادیبوں، فنکاروں میں خواجہ احمد عباس ایسے منفرد، مختلف تخلیق کار ہیں جن کو شہرت تو ملی، لیکن ادب و تنقید میں وہ مقام اور حیثیت نہیں ملی یا نہیں دی گئی جس کے وہ حق دار تھے۔ وہ بہ یک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس، صحافی، فلم ساز، ہدایت کار، کالم نویس، مقالہ نویس، سیاست داں، ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن اور "اپٹا" کے عہدیدار تھے۔ مد و دو شعرو قارئین و ناقدین نے اپنی پسند و ناپسند اور ترجیحات سے ان کو قبول کیا اور اکثر نے نہیں بھی کیا۔ اردو کے اہم اور ترقی پسند ادب کے کسی بھی بڑے اور سنجیدہ نقاد نے ان کو سنجیدگی سے نہیں لیا، ان پر کوئی معقول و مدلل مضمون نہیں لکھا۔ جنھوں نے لکھا انھوں نے بھی سنجیدگی اور دیانت داری نہیں دکھائی، بس اوپری سطح پر دیکھا اور سرسری انداز میں رائے قائم کر لی۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ زیادہ تر نقاد خواجہ احمد عباس کے تخلیق کردہ ادب کو مقصدی ادب کہہ کر دوسرے نمبر کا ادب ثابت کرتے ہیں۔ اس بات میں سچائی تو ہے، لیکن خواجہ احمد عباس نے کہانی کے فن، قصہ پن اور کیفیت و تاثر کو برقرار رکھنے کی بھی کوشش کی اور اکثر اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ایونٹس، سردار جی، معمار، زعفران کے پھول، زندگی، ساری رات، پاؤں میں پھول، انار چپے جان، نیلی ساڑی، ابابیل وغیرہ صرف خواجہ احمد عباس کی ہی نہیں اردو کی عمدہ کہانیاں ہیں۔ ایک فن کار اپنی زندگی میں چند اچھی کہانیاں اور دو ایک ناول بھی چھوڑ جائے تو وہ اسے زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوا کرتا ہے۔ ادب میں مقصدیت کا ہونا شجر ممنوعہ قطعی نہیں ہے۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ مقصدی ادب کے دائرے میں آتا ہے جو اپنے تضادات کے باوجود عظیم شعری سرمایہ ہے۔ پروفیسر فاطمی نے ادب کی مقصدیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہر شے کا اپنا ایک مقصد ہوتا ہے۔ خدا نے یہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی۔ انسان کی تشکیل بھی بے مقصد نہیں پھر ادب کس طرح بے مقصد ہو سکتا ہے۔ مقصدیت کا الزام لگانے والے ترقی پسندی یا اشتراکیت کی مخالفت کرنے والے اکثر خود بے مقصد ہو جاتے ہیں۔ ادب میں اس نوعیت کی باتیں کرنا غیر ادبی و غیر تنقیدی ہی نہیں بلکہ غیر اخلاقی اور غیر انسانی بھی ہے۔ پروفیسر فاطمی نے کہا کہ خواجہ احمد عباس کے آدرش ان کے جد امجد مولانا الطاف حسین حالی اور اردو افسانے کے باوا منشی پریم چند تھے اور خواجہ احمد عباس انہی کی روایت کی توسیع اور تفسیر۔

مقالہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر فخرالکریم صدیقی (سابق پرنسپل شیروانی انٹر کالج صلاح پور) نے کہا کہ پروفیسر فاطمی کا مقالہ عمدہ اور معلوماتی ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ادبی کارناموں کا انھوں نے بہ خوبی جائزہ لیا ہے۔ اردو کے معروف افسانہ نگار اسرار گاندھی نے کہا کہ خواجہ احمد عباس پر عام طور پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں، پروفیسر فاطمی نے اپنے مقالے میں بڑے سلیقے سے ان کا دفاع کیا ہے۔ خواجہ احمد عباس کے ساتھ اردو والوں نے ایماندارانہ رویہ نہیں اختیار کیا۔ الہ آباد یونیورسٹی میں شعبۂ عربی فارسی کے استاد ڈاکٹر حسین اختر نے کہا کہ پروفیسر فاطمی کا یہ خیال درست ہے کہ خواجہ احمد عباس چوں کہ ترقی پسندوں کے کسی گروہ میں شامل نہیں تھے اس لیے بیشتر ترقی پسند نقادوں نے انھیں ادب میں وہ مقام و مرتبہ نہیں دیا جس کے وہ حق دار تھے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر صالحہ زریں، ڈاکٹر حسین جیلانی، ڈاکٹر شہنواز عالم اور ریحان خاں وغیرہ نے بھی خواجہ احمد عباس کے سلسلے میں اپنی آرا پیش کرتے ہوئے مقالے کی پذیرائی کی۔

آندھرا پردیش اردو میڈیم سرکاری اسکولوں میں

## انفرا اسٹرکچر کی فراہمی کے اقدام

حیدرآباد (۱۹رجنوری)۔ ریاست کے اردو میڈیم سرکاری مدارس میں انفرا اسٹرکچر کی فراہمی محکمہ تعلیم کی ذمہ داری ہے لیکن محکمہ تعلیم نے اردو کی طرح اردو میڈیم مدارس کو بھی نظر انداز کردیا ہے۔ دارالحکومت حیدرآباد اور یا اضلاع ہر جگہ اردو میڈیم مدارس کی حالت ابتر ہے۔ کئی مدارس ایسے ہیں جہاں طلبہ اور اساتذہ کے لیے فرنیچر کا انتظام نہیں اور بیت الخلا بھی تعمیر نہیں کیے گئے۔ حکومت نے بنیادی سہولتوں کی فراہمی کا کام محکمہ تعلیم سے لینے کے بجائے اب اس کی ذمہ داری اردو اکیڈمی کو سونپ دی ہے۔ اردو اکیڈمی میں فروغ اردو کے لیے جو فنڈ مختص کیا گیا اس میں سے اردو میڈیم سرکاری اور امدادی مدارس میں انفرا اسٹرکچر کی فراہمی کے لیے امدادی اسکیم کا اعلان کیا گیا ہے۔ اردو مدارس کی ابتر صورت حال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ریاست میں موجود جملہ 2753 اردو مدارس میں سے 1309 مدارس کی جانب سے انفرا اسٹرکچر کی فراہمی کے لیے درخواستیں داخل کی گئی ہیں۔ ڈائرکٹر اردو اکیڈمی پروفیسر ایس اے شکور اس اسکیم پر تیزی سے عمل آوری کے اقدام کررہے ہیں تاکہ اردو میڈیم مدارس میں اساتذہ اور طلبہ کے لیے بنیادی سہولتیں فراہم کی جاسکیں۔ اس سے نہ صرف اسکول کا ماحول بہتر ہوگا بلکہ بہتر تعلیم کے مواقع بھی پیدا ہوں گے۔ فروغ اردو کے لیے جاریہ مالی سال میں حکومت نے آٹھ کروڑ روپے مختص کیے ہیں جس میں سے دو کروڑ پچاس لاکھ روپے اردو میڈیم مدارس کو انفرا اسٹرکچر کی فراہمی پر خرچ کیے جائیں گے۔ اس کے تحت پانی اسکولوں کو پچیس ہزار اور پرائمری و اپر پرائمری اسکولوں کو بیس ہزار روپے کی امداد دی جائے گی۔ امداد کے سلسلے میں درخواستیں اضلاع کے متعلقہ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کی تصدیق کے ساتھ طلب کی گئی ہیں۔ پروفیسر ایس اے شکور نے بتایا کہ بیشتر مدارس نے فرنیچر، الماری، اساتذہ کے لیے کرسی، بلیک بورڈ اور صاف پانی کی فراہمی کی ضرورت ظاہر کی ہے۔ حیدرآباد کے اردو میڈیم مدارس میں بنیادی سہولتوں کی کمی قابل غور ہے جبکہ دیگر میڈیم کے مدارس تمام سہولتوں سے آراستہ ہیں۔ انفرا اسٹرکچر کے لیے جملہ 1309 درخواستوں میں سب سے زیادہ درخواستیں حیدرآباد سے آئی ہیں۔ ریاست میں جملہ 2753 اردو میڈیم مدارس ہیں اس کے علاوہ دیگر میڈیم کے 446 مدارس میں متوازی طور پر اردو کلاسیں چلائی جاتی ہیں۔ ریاست میں اردو اساتذہ کی تعداد 6390 سے جب کہ اردو میڈیم طلبہ 2 لاکھ 24 ہزار 342 ہیں۔ اردو اکیڈمی نے تقریباً پانچ برس قبل اس طرح کی اسکیم پر عمل کیا تھا اور ہر اسکول کو 5000 روپے راست طور پر اسکول ہیڈ ماسٹر کو جاری کیے گئے تھے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

## ڈاکٹر لطیف سبحانی کو 'منشی پریم چند ایوارڈ' اور خیال انصاری کو 'ڈاکٹر ظ. انصاری ایوارڈ'

مالیگاؤں (پریس ریلیز)۔ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ مالیگاؤں اور اے اے لائبریری ٹرسٹ مالیگاؤں کے زیر اہتمام سینئر صحافی، ادیب اور شاعر خیال انصاری کی 27 سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں جشن ہفت روزہ 'خیر اندیش' کا اہتمام کیا گیا جس میں انھیں ڈاکٹر ظ. انصاری ایوارڈ سے نوازا گیا، نیز 'نقش خیال' کا اجرا بھی ہوا۔ اسی تقریب میں معروف شاعر، صحافی اور ادیب ڈاکٹر لطیف سبحانی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں 'منشی پریم چند ایوارڈ' سے سرفراز کیا گیا۔ جناب جمیل احمد (نائب میئر مالیگاؤں کارپوریشن) کے ہاتھوں مومنٹو، توصیفی سند اور شال عطا کی گئی۔ اس موقعے پر شہر کی علمی و ادبی شخصیتوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

## 23 معلم اردو سند یافتگان سے تقرری نامہ واپس لیے گئے

سوئی محمد بجنور (۲۳رجنوری)۔ اردو ٹیچروں کی بھرتی کے لیے کاؤنسلنگ کے بعد تقرری پانے 23 معلم اردو سند یافتگان کو محکمہ تعلیم جوائننگ دینے میں حیلہ بہانہ کررہا ہے۔ ان میں 20 امیدواروں سے تقرری لیٹر واپس بھی لے لیا گیا ہے۔ تین امیدواروں نے تقرری لیٹر واپس نہیں کیا ہے تو انھیں نتیجہ بھگتنے کی دھمکی دی جارہی ہے۔ ۱۱ اگست ۱۹۹۷ء سے قبل معلم اردو کی سند حاصل کرنے والوں کو بی ٹی سی کے برابر مان لیا گیا تھا۔ ان کو قریب گیارہ سال تک لمبی قانونی لڑائی کے بعد یہ حق حاصل ہوا تھا۔ اردو ٹیچروں کی بھرتی کے تحت کاؤنسلنگ کے بعد ۱۵رجنوری کو 23 امیدواروں کو بطور اردو ٹیچر تقرری کا لیٹر ملا۔ انھیں دس دن کے اندر پرائمری اسکولوں میں جوائن کرنا تھا۔ جب امیدوار اپنا تقرری لیٹر لے کر بی ایس اے دفتر گئے تو افسران اور اردو بابو انھیں جوائن کی چٹھی کا کہہ کر دوڑاتے رہے۔ اس بیچ دفتر کے اردو بابو اور اے بی ایس اے چندر بھوشن نے امیدواروں سے ان کے تقرری لیٹر یہ کہہ کر لے لیے کہ وزیر اعلا نے تقرری رد کردی ہے۔ کچھ دن بعد ترمیم شدہ حکم آنے کا تب آپ لوگوں کو تعیناتی کے لیے تقرری لیٹر جاری کیا جائے گا۔ لیکن تین امیدوار محمد اظہر، محمد اعظم اور نظام الدین انصاری نے اپنے تقرری لیٹر دفتر کو نہیں سونپے۔ تینوں امیدواروں کا کہنا ہے کہ تقرری لیٹر واپس کرنے کی واجب وجہ بی ایس اے اور اے بی ایس اے کوئی نہیں بتا رہا۔ اردو بابو بھی اس بارے میں کچھ جانکاری نہیں دے رہے ہیں۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

ڈاکٹر قمر جہاں کی رحلت پر

## تعزیتی جلسہ

ناگپور (پریس ریلیز)۔ راشٹر سنت تکڑوجی مہاراج ناگپور یونیورسٹی کے کالجوں کے اردو، عربی اور فارسی ٹیچرز کی انجمن 'بزم ادب ناگپور' کی جانب سے اردو کی معروف افسانہ نگار ڈاکٹر قمر جہاں کی رحلت پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر غیاث الرحمن نے فرمائی۔ اس موقعے پر معروف شاعر ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحومہ ڈاکٹر قمر جہاں کا نام اس لیے اہم ہے کہ انھوں نے اپنے وقت میں ادب کی زیادہ کی جب خلاق دور میں خواتین قلم کار کا فقدان ہے۔ ڈاکٹر اسداللہ نے قمر جہاں کی رحلت کو بڑا ادبی نقصان بتایا۔ تعزیتی نشست میں جناب خضر حیات، ڈاکٹر غلام السیدین ربانی، ڈاکٹر اظہر حیات، ڈاکٹر صبیحہ کوثر، ڈاکٹر انجم آرا، ڈاکٹر ناہید سوری، پروفیسر نصرت مہدی اور پروفیسر محمد اسرار نے بھی قمر جہاں کی ذاتی خوبیوں اور ان کے افسانوں کی مختلف خصوصیات کا ذکر کیا۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر قمر جہاں کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'دھوپ چھاؤں' ۲۰۰۵ء میں اور 'زندگی تیرے لیے' ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔ دونوں مجموعوں پر مختلف اکادمیوں نے انعامات سے بھی نوازا۔ مرحومہ مقامی ایل اے ڈی ڈگری کالج میں شعبۂ اردو و فارسی کی صدر تھیں۔

آخر میں صدر جلسہ ڈاکٹر غیاث الرحمن کے دعائیہ کلمات پر نشست کا اختتام ہوا۔ اس موقعے پر مرحومہ کے شوہر ڈاکٹر عباس علی بھی موجود تھے۔

## اک دیا اور بجھا

بھوبنیشور (اڈیسہ)۔ اڈیسہ میں اردو اور انگریزی کے مایہ ناز شاعر اور نثر نگار حیدر نایاب صاحب کا مختصر علالت کے بعد ۱۶رد سمبر ۲۰۱۲ء کو بھوبنیشور میں انتقال ہوگیا اور اسی روز شام کو بھوبنیشور کے سیتیہ نگر قبرستان میں مدفون ہوئے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور پانچ بیٹیاں شامل ہیں۔ یہ اطلاع ہمیں پروفیسر کرامت علی کرامت (کٹک) نے دی ہے۔ سید رحمت اللہ اکرام کے شاگردوں میں حیدر نایاب کا ایک اہم مقام ہے۔ اردو میں موصوف کے دو شعری مجموعے 'لمحوں کی بازگشت' (۱۹۷۱ء)، 'دائرہ در دائرہ' (۱۹۹۴ء)، انگریزی میں دو نظموں کے مجموعے Uneven Wavelengths (1997), Unfettered Tetrameters (2001) اور اردو ناول 'ترنگ' کا ہندی ترجمہ زیور طباعت سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ انگریزی نثر میں لکھی گئی ان کی کتاب The Progressive Philosophy کو Sterling Publishers pvt. ltd. نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب پر امریکہ سے ان کو ڈی لٹ کی ڈگری بھی مل چکی ہے۔ موصوف ۱۵رجولائی ۱۹۳۰ء کو اچھا پورم (آندھرا پردیش) میں پیدا ہوئے۔ آندھرا یونیورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں بی ای پاس کرنے کے بعد ۱۹۵۵ء سے صوبہ اڈیسہ کے محکمۂ پبلک ہیلتھ میں سرکاری ملازمت شروع کی اور ۱۹۸۹ء میں چیف انجینئر کے اعلا عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ حیدر نایاب کے تین اردو ناول اور تین انگریزی مضامین کے مجموعے طباعت کے انتظار میں ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

نئی دہلی۔ مشہور شاعر، ادیب اور آرٹسٹ خالد بن سہیل کا ۱۷رجنوری ۲۰۱۳ء کو گجرات کے سورت شہر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین ۱۸رجنوری کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ انھیں ذیابیطس کا عارضہ تھا۔ خالد بن سہیل کا تعلق پورا اتر پردیش سے تھا۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فائن آرٹ سے تعلیم حاصل کی تھی اور وہیں چند برس عارضی لکچرر کے طور پر تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔ انھوں نے ممبئی میں اسسٹنٹ آرٹ ڈائرکٹر کے طور پر فلموں میں بھی کام کیا تھا۔ مشہور شاعروں پر مشتمل علی سردار جعفری کے سیریل 'کہکشاں' اور فخرالدین علی احمد سے متعلق دستاویزی فلم کے علاوہ فلم 'اپنجز' میں بھی خالد بن سہیل نے آرٹ ڈائرکٹر کے طور پر کام کیا تھا۔ دہلی میں خالد بن سہیل نے آرٹ سے متعلق کئی نمائشیں لگائیں جن کی بہت پذیرائی ہوئی۔ دہلی میں جواہر لعل پارک پر بھی خالد بن سہیل کی خدمات بہت نمایاں رہی ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ۲۰۰۵ء میں 'مونولاگ' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

○

اردو کے مشہور شاعر مفتی عبدالجلیل صدیقی بہار بدایونی کا ۲۱رجنوری ۲۰۱۳ء کو کوٹہ (راجستھان) میں انتقال ہوگیا۔ وہ ۸۰ برس کے تھے۔ یہ اطلاع ہمیں جناب تسلیم غوری بدایونی نے دی ہے۔

بہار بدایونی کی ولادت یکم جولائی ۱۹۳۳ء کو بدایوں میں ہوئی تھی۔ ابتدائی دور میں انھوں نے اپنے والد ماجد وفا بدایونی سے اپنے کلام پر اصلاح لی، لیکن وفا بدایونی کی وفات کے بعد ۱۹۶۰ء میں وہ مولانا ابر احسنی گنوری کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ بہار بدایونی کا کلام اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ۱۹۵۳ء میں وہ محکمۂ ریلوے میں ملازم ہوئے اور کوٹہ راجستھان کو اپنا وطن ثانی بنالیا اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

# نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : رباعیات رواں
مصنف : جگت موہن لال رواں
مرتب : عادل اسیر دہلوی
اشاعت : ۲۰۱۳ء
ضخامت : ۴۰ صفحات
قیمت : ۴۰ روپے
ناشر : ملک بک ڈپو، 3212، ترکمان گیٹ، دہلی-۶
تبصرہ نگار : ایس اے رحمٰن

نصاب کی کتابوں میں رباعی کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے کہ رباعی عربی میں چار کو کہتے ہیں اور اسی طرح رباعی صرف چار مصرعوں کی نظم ہوتی ہے جس میں پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ ہوتا ہے۔ رباعی میں اخلاقی، مذہبی اور فلسفیانہ مضامین خصوصیت سے لائے جاتے ہیں۔ لہٰذا پہلے مصرعے سے ہوتی ہے، دوسرے اور تیسرے مصرعے میں اس کی وضاحت اور تشریح ہوتی ہے اور چوتھے مصرعے میں حاصل کلام ہوتا ہے۔ یہی چوتھا مصرعہ رباعی کی جان ہوتا ہے اور اسی مصرعے کی جامعیت اور بلاغت پر رباعی کی سنائی اور عمدگی کا دارومدار ہوتا ہے۔ اردو میں میر انیس، حالی، اکبر، امجد حیدرآبادی، جگت موہن لال رواں، جوش اور فراق کی رباعیاں خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعہ رباعیات جگت موہن لال رواں کی ہی کاوشیں ہیں۔ موصوف کی یہ رباعیاں تین کتابوں 'رباعیات رواں'، 'روح رواں' اور 'باقیات رواں' میں پھیلی ہوئی تھیں جنھیں عادل اسیر دہلوی نے اس مختصری کتاب میں یکجا کردیا ہے۔ جگت موہن لال رواں پیشے سے وکیل تھے لیکن اردو ادب کا شوق و ذوق تھی۔ اگرچہ وہ اپنی رباعیات کے لیے زیادہ معروف ہیں لیکن وہ غزل کے بھی شاعر تھے۔ اسی غزل کے جسے اردو شاعری کی آبرو کہا جاتا ہے۔ مرتب کتاب نے اپنے پیش لفظ میں جگت موہن لال رواں کی زندگی اور شعری کنٹری بیوشن کے بارے میں اختصار سے اہم معلومات فراہم کردی ہیں، جس میں موصوف نے یہ بھی بتایا ہے کہ رواں اگرچہ ایک کامیاب وکیل تھے لیکن وہ اپنی وکالت کو شاعری کے مقابلے میں اپنی فطرت کے خلاف سمجھتے تھے۔ تو ایسے شاعر کی درج ذیل رباعیاں دیکھیے اور اس کی ذہانت اور صلاحیتوں کی پذیرائی کیجیے

کچھ وقت اگر خوشی میں کٹ جاتا ہے
تسکین ہوتی ہے، رنج بٹ جاتا ہے
اکثر تو کچھ ایسا حال ہوتا ہے رواں
بالکل دنیا سے جی اُچٹ جاتا ہے

---

کیا قدر محبت میں ہے ارمانوں کی
تفصیل بہت صاف ہے پروانوں کی
مت موذیٔ یا فرض سے اے بندۂ حرص
انساں نہیں، شکل ہے انسانوں کی

---

فکر دل دردمند کرلیتا ہوں
فرق پست و بلند کرلیتا ہوں
دیکھے نہیں جاتے جب خود اپنے اعمال
میں اپنی آنکھ بند کرلیتا ہوں

کتاب لیزر کمپوزنگ میں صاف ستھری شائع ہوئی ہے جس کا سرورق جگت موہن لال رواں کے عکس سے سجا ہوا ہے۔

●◆●

نام کتاب : اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے چند اہم انشائیہ نگار
ایک تجزیاتی مطالعہ
مصنفہ : ڈاکٹر ہاجرہ بانو
ضخامت : ۳۰۵ صفحات
قیمت : ۳۰۰ روپے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز
اے-۲۰۷، گراؤنڈ فلور، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی
دہلی ۱۱۰۰۹۵
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

اردو ادب میں انشائیہ کی روایت بہت پرانی نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو یہ صنف بھی مغرب کی دین ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے، جن کا طبعی میلان ابتدا ہی سے انشائیہ کی جانب رہا ہے اور جو خود بھی انشائیہ نگار ہیں، پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے مذکورہ موضوع کا انتخاب کرلیا اور مرزا اختر بیگ کی نگرانی میں اس کو بہ خوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ حال ہی میں یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ کر منظر عام پر آچکا ہے۔ چھ ابواب پر مشتمل یہ مقالہ وسیع مطالعے، دقیقہ شناسی اور کڑی محنت کا آئینہ دار ہے۔

پہلے باب 'انشائیہ کے خد و خال' میں مقالہ نگار نے اردو ادب میں انشائیہ کے سفر اور اردو تحریروں میں انشائیہ کے ابتدائی نقوش کھوجنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں ملاوجہی کی 'سب رس' اور مکتوبات غالب کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے۔ یہ اس زمانے کی نگارشات ہیں جب مغرب میں انشائیہ نگاری کے موجد مونتین اور بیکن پرسنل یا لائٹ ایسیز (Personal or Light Essays) لکھ کر شہرت حاصل کرچکے تھے۔ یہ صنف محمد حسین آزاد (نیرنگ خیال، آب حیات، دربار اکبری)، عبدالحلیم شرر اور چند مزاح نگاروں کے قلم کی زینت بن کر مہدی افادی، حسن نظامی، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری اور سجاد انصاری جیسے جدید انشائیہ نگاروں کی تحریروں سے پروان چڑھی اور پھر موجودہ دور کے انشائیہ نگاروں جیسے وزیر آغا، فکر تونسوی، مشفق خواجہ، انور سدید، مشتاق احمد یوسفی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین تک آپہنچی۔ اس باب میں 'سب رس' کا مدلل تجزیہ اور انشائیہ کے عناصر کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ باب دوم 'انشائیہ ایک منفرد اسلوب نگارش' میں مقالہ نگار نے انشائیہ کی تعریف، اقسام اور موضوعی تنوع کے حوالے سے بحث کی ہے۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے اس باب میں یہ بھی کوشش کی ہے کہ انشائیہ اور دوسرے نثری اصناف مثلاً مضمون نگاری، مقالہ نگاری، پیروڈی، خاکہ نگاری اور طنز و مزاح نگاری کے درمیان تفاوت کو اجاگر کرے اور اس بارے میں سرسید، یلدرم، پطرس، نکور، حسن نظامی اور سلطان حیدر جوش وغیرہ کی نگارشات کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے چند معروف انشائیہ نگاروں کے اقتباسات بھی درج کیے ہیں تاکہ قاری کو انشائیہ نگاری کی خصوصیات کا بہ خوبی اندازہ ہوسکے اور ایسا کرنے میں وہ سرخرو ہوچکی ہیں۔

تیسرے باب کا عنوان 'انشائیہ کی اہمیت اور افادیت' ہے جس میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ 'انشائیہ اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی شعور کا آئینہ دار ہوتا ہے۔' اس باب میں کئی ہندستانی اور پاکستانی انشائیہ نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں اور یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا معتبر انشائیہ نگار ضرور ہیں مگر بقول پروفیسر سلیم اختر اس صنف کے "باوا آدم" نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں مقالہ نگار کا ادعا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے سبب انشائیہ نگاری کو بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

باب چہارم 'انشائیہ بیسویں صدی میں' کے تحت مقالہ نگار نے ۱۰۵ ہندستانی انشائیہ نگاروں کی فہرست، ان کی پیدائش کا مقام و تاریخ اور مرحومین کی تاریخ وفات پیش کی ہے اور اس کے بعد ان کی حیات اور فن پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ باب پنجم 'انشائیہ پاکستان میں' میں مصنفہ نے ۳۰ پاکستانی انشائیہ نگاروں کے کوائف اور فن کے بارے میں اختصار کے ساتھ بحث کی ہے۔ باب ششم 'انشائیہ نگاری مغرب میں' کے تحت مقالہ نگار نے مغربی انشائیہ نگاروں جیسے مونتین، بیکن، روس برگ، چارلس لیمب، گارڈنر، لوکس، ریلک، رابرٹ لینڈ، چسٹرٹن، ساتھم، مان تھامس ہکسلے، برلوم اور آرویل جارج کے فن پر روشنی ڈالی ہے۔

آخر میں 'ماحصل' عنوان کے تحت ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے اپنے مقالے کا لب لباب بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ جہاں تک اسلوب نگارش کا سوال ہے، انھوں نے غیر ضروری اصطلاحات سے احتراز کیا ہے اور سلیس و شگفتہ زبان میں یہ مقالہ قلم بند کیا ہے۔

مقالے کے حجم اور حد بندی کے مدنظر میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے۔ اردو ادب میں انشائیہ کے ارتقا کو سمجھنے کے لیے یہ تصنیف قاری کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوگی۔ اتنا ہی نہیں ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے شائقین کے لیے بھی یہ حوالہ جاتی دستاویز رکھتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ زیر نظر کتاب اردو ادب کے لیے ایک نادر تحفہ ہے کیوں کہ موجودہ دور کی سہولت پسندی نے مقالوں کا معیار اتنا پست کردیا ہے کہ ان میں نہ گہرائی ہے، نہ وسعت نظر آتی ہے اور نہ ہی عمق۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ہاجرہ بانو مبارک باد کی مستحق ہیں۔

●◆●

## بقیہ: لطف الرحمٰن کی غزل گوئی...

صفحہ ۸ سے آگے

یا ضرورت کو دخل نہیں تھا اس لیے دوسرے مصرعے میں کچھ لوگ بک گئے ہیں شرافت کے باوجود کہہ کر اس صورت حال کو سیدھے سادے انداز میں بیان کردیا مگر اس لطف کے ساتھ کہ یہاں معصر ہمارے عہد کی علامت بھی ہے جہاں ہر جنس، جنس بازار میں تبدیل ہوچکی ہے یعنی اپنی اخلاقیات سے محروم ہوچکی ہے جس کی ایک شق شرافت بھی ہے اور پھر اس طرح کہ ہمارے عہد میں یہ بازاری پن شرافت سے تضاد کا رشتہ نہیں رکھتا بلکہ اس کے لازمے کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ اس طرح ایک بظاہر سادہ سا شعر ہماری اخلاقی قدروں کی بھی نشاندہی کرتا ہے اور اس میں آنے والی گراوٹ یا تبدیلی کو بھی نہ صرف یہ کہ بیان کردیتا ہے بلکہ ان دو الگ الگ صورتوں کو بیان کرکے ہمیں انسانی ارتقا کی رفتار، کردار اور اس کی قیمت اور ہماری اخلاقیات وغیرہ کے مسئلے پر بہت کچھ سوچنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ آدمی کے جنس بازار میں تبدیل ہوجانے کی طرف اشارہ انھوں نے اپنے اس شعر میں بھی کیا ہے:

ہر نظر اپنے خریدار کے خوابوں میں رواں
ہر جبیں پر کوئی تحریر ہے قیمت جیسی

یہ شعر اگرچہ اس شعر جیسا تہہ دار نہیں مگر اس میں بھی جبیں کی رعایت سے تحریر کا استعمال لطف سے خالی نہیں۔ اس غزل میں یہ شعر بھی بہت عمدہ ہے۔

ہنسیں لے کے چلے آئے گروں گلیوں میں
ہر نظر اٹھنے لگی سنگ ملامت جیسی

اب یہ شعر دیکھیے:

نہیں کہ چاند ستارے ہی منتظر ہیں ترے
تری طلب میں تو روشن مری نگاہ بھی ہے

یہ شعر ادعائے باطنی بدیعہ 'کامل' کی عمدہ مثال ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ لطف الرحمٰن صاحب نے اس کا التزام کیا ہے یا یہ محض اتفاقی امر ہے۔ ادعائے باطنی بدیعہ کامل کا ذکر علم بیان کے چند ماہرین نے تشبیہ کے ذیل میں کیا ہے مثلاً چند دتاتریہ کیفی نے تسیم کے اس شعر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

دکھلاتا تھا وہ مکاں جادو
محراب سے در سے ابرو

"محراب کو ابرو سے تشبیہ دی ہے اور در کو چشم سے۔ پہلے میں وجہ شبہ وہ گولائی ہے جو محراب اور ابرو میں

پائی جاتی ہے۔ دوسرے میں واشد کی جو روشنی میں محسوس ہے اور یہ وجہ تشبیہ واحد ہے۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ مشبہ بہ کو مشبہ پر عرف حاصل ہوتا ہے۔ اور محراب ہمیشہ مشبہ بہ ہوتی ہے اور ابرو مشبہ جبکہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی مشبہ بہ یہاں ادنیٰ ہے اور مشبہ اعلیٰ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تسلیم بھی کرلیں کہ یہ مسلم ہے تو اس میں ادعا ہے کہ محراب وہ ایسے تھے کہ ان کو چشم و ابرو سے تشبیہ دے سکتے تھے۔ اس ادعا کا نام اصطلاح میں ادعائے ناقص بدرجۂ کامل ہے یعنی ناقص کو کامل کہنا"۔

غالب کا یہ شعر ادعائے ناقص بدرجۂ کامل کی عمدہ مثال ہے:

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

طباطبائی نے اس شعر کی شرح بہت جامعیت سے لکھی ہے کیوں کہ ان کی نظر اس التزام پر نہیں گئی۔ اس صنعت کا نام ماہرین بیان نے ادعائے ناقص بدرجۂ کامل اس لیے رکھا ہوگا کہ تشبیہ کا عام قاعدہ یہ ہے کہ کوچے کی حیثیت مشبہ کی ہوتی ہے اور بہشت کی مشبہ بہ کی یعنی کوچے کو بہشت سے تشبیہ دی جاتی ہے نہ یہ کہ بہشت کو کوچے سے۔ چناں چہ اگر کوئی بہشت کو کوچے سے تشبیہ دے تو یہ نقص ہے مگر یہ کام اگر اس طرح کیا جائے کہ مشبہ کی کوئی ایسی خصوصیت بیان کر دی جائے جس کی روشنی میں اس کی فوقیت مشبہ بہ پر ثابت ہو کر واضح معلوم ہو جائے تو یہ ادعا درجۂ کمال پر پہنچ جائے۔ یہ صنعت غالب کو بہت مرغوب تھی انھوں نے مذکورہ بالا شعر میں بہشت کو کوچۂ معشوق کے برابر تسلیم نہ کرنے کا جواز یہ دیا کہ نقشہ تو وہی ہے جو معشوق کے کوچے کا ہے ولے وہ یعنی بہشت اس قدر آباد نہیں۔ اسی طرح غالب نے کہا ہے:

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

شب فراق کی درازی اور سختی کو قیامت سے تعبیر تو سب ہی کرتے ہیں۔ مگر قیامت کی درازی و سختی کو شب فراق کی درازی سے بڑھ کر صرف غالب ہی بتا سکتے تھے۔ اسی کو ادعائے ناقص بدرجۂ کامل کہتے ہیں۔ لطف الرحمٰن صاحب کا جو شعر ہم نے ابھی نقل کیا اس میں بھی ادعائے ناقص بدرجۂ کامل کیا گیا ہے اور اس خوب صورتی کے ساتھ کہ بے ساختہ یقین کرلینے کو جی چاہتا ہے کہ چاند تارے بھی اسی کی طلب میں روشن ہیں جس کی طلب نے شاعر کی نگاہ کو روشن رکھا ہے۔ اس شعر کو کوئی معمولی شاعر کہتا تو کہتا کہ میری نگاہ ہی تیری طلب سے روشن نہیں بلکہ چاند تارے بھی تمھارے منتظر ہیں مگر لطف الرحمٰن نے کمال ہنرمندی سے کہا کہ:

نہیں کہ چاند ستارے ہی منتظر ہیں ترے
تری طلب میں تو روشن مری نگاہ بھی ہے

ان کے کچھ اور عمدہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

مرے جنوں کا تقاضا ہے مختلف تجھ سے
دیار ہجر ہے تیرے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

وہ چاہ دنیا بھی ہوئی تنگ جنوں پر
وہ جہاں افلاک کشادہ بھی نہیں ہے

صبح ازل بھی ایک قیامت سے کم نہ تھی
وہ بوجھ دے گئی کہ تماشہ بنا دیا

---

تو مگر اتنا نہ تھا پھر تو روشن بھی
تجھ سے پہلے کا زمانہ ان میں میرا بھی تو
مجھ کو آتی ہوئی خیمے ہیں بھی مسرور امید ہیں
سبھی سب گشتہ ہے بعد کیا ہے یہ عذابوں کی

---

ثبت ہو کر رہ گئی آنکھوں پہ اک منظر کی
اک مسافر گرد میں قیام نہاں ہوتا ہوا
تو اپنے راستے مڑ کر ذرا سنبھل کے رکھ
کہ قافلے میں ہر اک شخص معتبر بھی نہیں

یہی ہے انجمن اے دوستو خالی جنازوں کی
انھی کی سرپرستی میں تجارت ہے گلابوں کی
بدن کی قربتوں سے اس کی دوری کم نہیں ہوتی
یہ تنہائی کی پنداری بھی مدھم نہیں ہوتی

---

پھیل جاتا ہے کئی صدیوں پہ سائے کی طرح
بوجھ سے اپنے کوئی لمحہ گراں ہوتا ہوا
چاند نے کیا پانے کیا جھٹکے سمندر سے کیا
ایک اک قطرہ وفا جب گراں ہوتا ہوا
رفتہ رفتہ اڑ گئے روشن ستاروں کے حروف
میں بھی ہوں لمحہ بہ لمحہ داستاں ہوتا ہوا

آخری شعر میں اڑ جانے یعنی ہوا میں تحلیل ہو جانے کی رعایت سے داستاں ہونے یعنی پھیل جانے کے پہلو کو بھی ملحوظ رکھیں تو یہ شعر مزید لطف کا حامل ہو جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعے میں قدم قدم پر اس طرح کے شعر مل جائیں گے اور ان غزلوں میں بھی جو رسائل کی فائلوں میں دفن ہیں اور کسی مجموعے میں شامل نہ ہو سکیں۔ اور اگر کسی شاعر کے یہاں کچھ شعر بھی ایسے مل جائیں تو اس کے نمائندہ شاعر ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ لطف الرحمٰن جدیدیت کے ہی نہیں اردو کے بھی نمائندہ شاعر تھے وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کے یہ اشعار ان کو ہمیشہ ہمارے درمیان رکھیں گے۔

■○■



## بقیہ: دورِ آئندہ کی ادیبہ قرۃ العین حیدر

صفحہ ۳ سے آگے

ایک رخ ہے، وہ بالکل ضبط و توازن، تنظیم، خیالات کی صراحت، ان باتوں سے مختلف چیز ہوتی ہے، جس سے پورے ادب کا رخ بدلا، انیسویں صدی سے، یعنی اس میں تخیل اور اندرونی فکری عمل جو بھی ہے اس پر زور دیا جانا چاہیے"۔

یہاں یہ یاد رہے کہ قرۃ العین حیدر کے والد محترم سجاد حیدر یلدرم اردو ادب میں رومانی تحریک کے روحِ رواں تھے اور ایک صاحبِ طرز ادیب بھی۔ خود قرۃ العین حیدر ان کی قائل تھیں اور جا بجا انھوں نے اپنے والد کی تعریف و توصیف بھی کی ہے۔

قرۃ العین حیدر اصلی ترقی پسند اور اصلی جدید ہیں، ان کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کی فکر اور ان کے طرزِ تحریر کو کسی دائرے میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، بہ قول یاور عباس، انھوں نے کبھی اپنے قلب کو اپنے ضمیر سے جدا نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے اصل میدان، افسانے اور ناول کے علاوہ دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔ انھوں نے خاکے لکھے، رپورتاژ لکھے (رپورتاژ کو انھوں نے ایک نئی جہت اور معنویت عطا کی)، مضامین لکھے، تبصرے لکھے، اردو میں بھی، اور انگریزی میں بھی، حتیٰ کہ ایک فلم (ایک مسافر ایک حسینہ) بھی لکھی۔ انھوں نے ریڈیو پر نشریات کیں، رسائل و جرائد کی ادارت کی، محکمۂ اطلاعات کو اپنی خدمات تفویض کیں اور یہاں تک کہ دیگر سرکاری ملازمتیں بھی کیں، ان کا میدان عمل ہندستان سے پاکستان اور برطانیہ تک وسیع رہا۔ ایسی ہی گوناگوں شخصیت تھی ان کی۔

قرۃ العین حیدر کی مدت کار کم و بیش ستر برس پر محیط ہے، یہ ایک طویل عرصہ ہے جو شاید کم ہی فنکاروں کو نصیب ہوا ہوگا، کیوں کہ ایسے کتنے لوگ ہوں گے، جنھوں نے محض گیارہ برس کی عمر میں لکھنا شروع کر دیا ہو۔ (مولانا آزاد کو مستثنیٰ قرار دیں) اور فقط بائیس برس کی عمر میں، جس کی پہلی تصنیف منظرِ عام پر آئی ہو۔ لیکن ایک اہم بات اور کہ اس طویل عرصے میں انھوں نے کل جمع ستر پچھتر افسانے لکھے، جن میں سے صرف ۴۲ ان کے چار مجموعوں میں شامل ہوئے، باقی کی دریافت بعد میں ہوئی جو ان کی کلیات کا حصہ ہے۔ کل جمع یعنی حاصل قلم، سات عدد ناول، چھ ناولٹ، ایک طویل سوانحی ناول، گیارہ رپورتاژ، چند خاکے، کچھ تراجم اور کچھ بچوں کی کتابیں، اس کے علاوہ کچھ مرتبہ کتابیں، انگریزی میں نظمیں، درجنوں مضامین و تبصرے۔ ظاہر ہے کہ کل وقتی قلم کاری کے لحاظ سے نگارشات کی یہ تعداد بہت زیادہ نہیں، لیکن جو کچھ ہے بہت خوب ہے اور اعلا پائے کا ہے، یہی ان کا کمال ہے۔

اپنی تمام تر جدت پسندی کے باوجود وہ اپنے ماضی میں جیتی تھیں جس کا اعتراف انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کیا ہے:

"انسان بنیادی طور پر ناسٹلجک ہوتا ہے۔ آپ کو بھی اپنے کالج کے زمانے کے دوستوں سے مل کر خوشی ہوتی ہوگی۔ ہمیں بھی پرانے ساتھیوں سے مل کر اچھا لگتا ہے۔ اب آج جو ماحول ہے ملک میں چاروں طرف خون خرابہ، افراتفری اسے دیکھ کر تو ہمیں اپنا زمانہ یاد آتا ہے"۔

علامہ اقبال نے جن دیدہ وروں کا ذکر کیا ہے، قرۃ العین حیدر یقیناً ان میں سے ایک ہیں۔ نرگس جانے کب تک اپنی بے نوری پہ روئے گی، جب جا کر دوسری ایسی آپا پیدا ہوں گی یا شاید کبھی نہیں ہوں گی۔ ان کی عظمت، پختگی و ہمہ گیری بے مثل ہے۔

اختتاماً، مغربی طرز کی اس خالصتاً مشرقی ادیبہ کو سلام کہ اس مختصر مضمون میں اس سے ہو ممکن نہیں۔

■○■

# لطف الرحمن کی غزل گوئی پر ایک نظر

جاوید رحمانی (336 اے پی بدھ وہار، نزد جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی-110067)
E-mail: rahmanijnu@gmail.com

اردو کی ادبی تنقید نے پچھلے پچاس برسوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور ادبی تصورات و نظریات کی نہ صرف افزائش بلکہ درآمد کی رفتار بھی اتنی تیز رہی ہے کہ پچھلی نصف صدی ادبی تنقید کی صدی معلوم ہوتی ہے۔ ادبی تنقید کی اس حیرت انگیز ترقی کے باوجود ہماری تنقیدی فہم و فراست کا اب بھی یہ عالم ہے کہ آج بھی ہماری درسگاہوں اور یونیورسٹیوں میں ایسے سادہ لوح استاد قدم قدم پر مل جاتے ہیں جو فراق صاحب کے اندازے کی دقیقہ سنجی اور خیال آفرینی کو بھی ادبی تنقید سمجھتے ہیں اور ایسے سادہ لوح استاد بھی کم نہیں ہیں جن کو حسن عسکری کی مریضانہ فکر اور اس کے تغیرات میں مسلسل نور فکر کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اب بھی اردو میں بنام تنقید لکھے جانے والے بڑے حصے کو رعایتی نمبروں پر بھی تنقید کے خانے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اردو کی مرکزی صنف غزل ہے اور اس میں شک نہیں کہ اردو کی بہترین ادبی تنقید بھی وہ ہے جو غزل پر لکھی گئی ہے اور بدترین ادبی تنقید بھی وہ ہے جو غزل کی تنقید کے نام پر لکھی گئی ہے۔ لیکن غزل کی تنقید میں بھی ہمارے بڑے بڑے نقاد اب بھی مہدی افادی کے "عناصر خمسہ" والے رویے کے ایسے شہید ہیں اور ان کا ذہن ان کے زیر اثر اس طرح کام کرتا ہے کہ اب بھی جدید غزل کے پانچ پیش رو، اردو غزل کے ارکان ثلاثہ اور اردو غزل کے دس بڑے شاعر وغیرہ وغیرہ جیسے فقرے نہ صرف سننے کو بلکہ پڑھنے کو بھی مل جاتے ہیں اور ان کو پوری سنجیدگی سے ادبی تنقید یا ادبی تنقید جیسی چیز سمجھا جاتا ہے یہاں پر ایک دلچسپ لطیفہ فراق صاحب کا بھی سنتے چلیں۔ غلام رضوی گردش نے باقر مہدی پر جو خاکہ لکھا ہے اس میں لکھا ہے کہ فراق صاحب نے کہا کہ اردو میں کل بارہ بڑے شاعر ہیں پہلے میر دوسرے غالب اور تیسرے ...... اس پر باقر مہدی نے شوخی سے کہا بارہویں فراق گورکھپوری ہیں۔ وہ فوراً دیدہ نچاتے ہوئے بولے آدمی ذہین معلوم ہوتے ہو۔ یہ تو خیر فراق صاحب ہی تھے۔ ان سے بہت پہلے ہمارے میر صاحب بھی ڈھائی شاعر یا خیر پونے تین کی جیسی باتیں فرما چکے ہیں اور غالب کی خود پسندی کے مظاہر بھی موجود ہیں نہ صرف شعر بلکہ نثر میں بھی۔ یہ تو خیر بڑے شاعر تھے، ہمارے معمولی شاعروں میں بھی یہ ادا کچھ کم نہیں مگر شاعر تو شاعر ہوتا ہے اگر وہ اپنے تئیں کوئی ایسا گمان رکھے تو اس سے ادبی استناد کا مسئلہ متاثر یا تو ہوتا ہی نہیں یا ہوتا بھی ہے تو بہت زیادہ نہیں ہوتا مگر مشکل تب آن پڑتی ہے جب ہمارا نقاد بھی ہمارے شاعروں کی خوش عقیدگی پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھنے لگتا ہے اور یہ دیکھے بغیر کہ جس شاعر کی خوش عقیدگی پر وہ ایمان لا رہا ہے وہ کس پایے کا شاعر ہے، اس کا مبلغ علم کیا ہے اس کی ادبی بصیرت کا کیا عالم ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسا بالعموم ہمارے نقادوں کی کم علمی اور تن آسانی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی کبھی ان کی پیشہ ورانہ ذہنیت کی وجہ سے بھی۔ اور ایسا بار بار ہونے سے ادبی پرکھ کے معیار بدلنے لگتے ہیں، ادبی استناد کا وقار گھٹنے لگتا ہے۔ وارث علوی نے لکھا بھی ہے:

"ہمارے یہاں مصیبت یہ ہوئی کہ جیسے ہی لکھنے لکھانے کا کاروبار چل پڑتا ہے تو کیا فن کار اور کیا نقاد دونوں ادب پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ نتیجہ ایسا ادب اور تنقید ہیں جو نا خواندہ لوگوں کے لیے عموماً نیم خواندہ لوگ لکھتے ہیں۔ ایک باشعور نقاد ادبی میڈیوکریٹی کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ حسن و خوبی پر اصرار کرتا ہے۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے تحت وہ خام کار لکھنے والوں کی تعریف نہیں کرتا۔ ایسا کرنے سے ادب کی پرکھ کے معیار بدل جاتے ہیں اور ادبی تصورات کی مستحکم فصیلوں میں شگاف پڑ جاتے ہیں۔"

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جدید غزل کے جن پانچ پیشروؤں کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے ان میں جگر، فانی، یگانہ، اصغر اور حسرت کے نام کچھ اس طرح لیے جاتے ہیں جیسے یہ ایک ہی معیار کے شاعر ہوں یا ایک ہی قبیل کے شاعر ہوں۔ جبکہ یہ دونوں باتیں غلط اور غلط محض ہیں۔ ان شعرا کے معیار بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور رنگ بھی۔ اصل میں ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ہم ایک بنیادی نکتہ فراموش کر دیتے ہیں کہ بڑے اور عظیم شاعر تو ہر زبان میں دو چار ہی ہوتے ہیں لیکن زبان کے لیے ان چھوٹے بڑے ہزاروں شاعروں کی بھی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی ان عظیم شاعروں کی۔ کیوں کہ اگر یہ تارے نہ ہوں تو صرف ایک یا دو چاند کافی نہیں ہوگا تزئین عرش کے لیے۔ اس لیے ہمیں ان میں سے ہر شاعر کو ان کے صحیح تناظر میں ہی رکھ کر دیکھنا چاہیے نہ یہ کہ ان کو غیر ضروری طور پر بڑا ثابت کرنے کی دھن میں ان کے جوہر اصلی پر بھی پردہ ڈال دینا چاہیے۔ یہ اور ایسے بہت سے مسائل ہیں جن پر گفتگو اور دو ٹوک گفتگو ضروری ہے کسی بھی شاعر کے مرتبے اور صحیح مرتبے پر روشنی ڈالنے کے لیے۔ اسی لیے یہاں اجمالی طور پر ان میں سے چند پر روشنی ڈالی گئی۔ جہاں تک لطف الرحمن کی شاعری کا تعلق ہے ان کی اصلی شناخت جدید شاعر کی حیثیت سے ہے ان کا شمار جدیدیت کے اہم نظریہ سازوں میں بھی ہوتا ہے، لیکن وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور چوں کہ ادبی تنقید سے بھی گہرا شغف رکھتے تھے اس لیے شعر بھی سوچ سمجھ کر کہتے تھے۔ جدید شاعری کے منظرنامے پر نظر ڈالیں تو ایک بات جو بہت واضح طور پر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت اردو زبان کا دائرہ بتدریج سمٹتا جا رہا تھا لیکن شاعری اور تنقید کے میدان میں حیرت انگیز گہما گہمی نظر آ رہی تھی۔ ہندوستان کے اردو شاعروں میں بھی اور پاکستان کے اردو شاعروں میں بھی دو اہم دھارے موجود تھے۔ ایک دھارے میں وہ شاعر تھے جو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ شعر کہتے اور اسی میں اپنے تخلیقی وفور کے اظہار کو اصل شاعری سمجھتے تھے دوسرے دھارے میں وہ شاعر تھے جو زبان کے دائرے کی توسیع کے نام پر مسلمہ اصولوں سے انحراف کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں بھی تخلیقی وفور کی کمی نہیں تھی اور زبان و بیان پر قدرت بھی رکھتے تھے لیکن نئے نئے تجربوں کے شوق میں کبھی کبھی ان کے شعر مہمل بھی معلوم ہونے لگتے تھے۔

لطف الرحمن کا تعلق پہلے دھارے سے تھا۔ انھوں نے زبان و بیان کے تجربوں میں بہت دلچسپی نہیں لی اور غزل کے مسلمہ ضابطوں کی پابندی کرتے ہوئے شعر کہتے رہے۔ انھوں نے فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اردو کے ادبی سرمایے پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے آزاد اور معریٰ نظمیں بھی کہیں مگر ان کا اصلی جوہر غزل میں کھلتا ہے۔ ان کی غزلوں میں تخلیقی وفور بظاہر بہت نظر نہیں آتا لیکن ایک خاص معیار کا التزام ہر جگہ ملتا ہے اور کہیں کہیں تو وہ کوندا بھی لپک اٹھتا ہے جس کی ہر تان دیپک کہی جا سکتی ہے اور جس کی آرزو ہر فن کار کو تمام عمر سرگرداں رکھتی ہے۔ اس مضمون میں ہم ان کے دو چار شعروں پر ادبی نقطۂ نظر سے گفتگو کریں گے۔ یہ شعر دیکھیے:

کچھ رسم ہی عجیب تھی بازار مصر کی
کچھ لوگ بک گئے ہیں شرافت کے باوجود

مصر کی تلمیح اردو شعرا کی مرغوب ترین تلمیح رہی ہے۔ ایسی تلمیحات کا استعمال خطرے سے خالی نہیں ہوتا کیوں کہ انھیں اتنی بار برتا جا چکا ہوتا ہے کہ ان میں جدت پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا مگر لطف الرحمن صاحب نے اس تلمیح کے بالکل انوکھے پہلو کو اور وہ بھی بہت دل نشین پیرایے میں باندھا ہے۔ مصر میں حضرت یوسف کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو مصر کی رسم سے تعبیر کیا اور حضرت یوسف کے بکنے میں چوں کہ ان کی مرضی

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر و پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org